تہذیبی تصادم: نئے تناظر میں

انیس احمد

اکیسویں صدی کی آمد کا اعلان علمی اور عالمی سیاسی حلقوں میں بعض پیشین گوئیوں اور دعووں کے ساتھ ہوا۔ مغربی سرمایہ داری نے اشتراکیت کی پسپائی کو اپنی فتح مندی سے تعبیر کرتے ہوئے نئے عالمی نظام کے نعرے کے ذریعہ ایک نئے معاشی سامراجی دور کے قیام کا اعلان کیا اور عالمی سطح پر ایسی تنظیمیں قائم کیں جو معاشی شاہراہوں پر اپنی پوری گرفت رکھ سکیں۔ چنانچہ NAFTA, WTO اور APEC کی شکل میں عملاً چند اقوام کی معاشی قیادت کے منصوبے کو عملی شکل دی گئی۔ اس طرح شمال کی جنوب پر معاشی حاکمیت کو نئی صدی کے حوالے سے مستحکم اور موثر بنانے کی کوشش کے ساتھ ابلاغ عامہ، تعلیم، اور ثقافت کے شعبوں میں بھی عالمگیریت کے زیر عنوان مغرب کی نمائندہ اقوام ہی پر نہیں جاپان جیسی معاشی طور پر ترقی یافتہ قوم پر حاوی ہونے کے لیے مناسب اقدامات کیے گئے۔

فکری محاذ پر مستقبل میں پیش آنے والے خطرات کے عکس کو ذہن میں لاتے ہوئے نوے کی دہائی میں امریکی مورخ سیموئل ہنٹنگٹن نے ۱۹۹۳ء میں نیویارک کے معروف سہ ماہی رسالے Foreign Affairs میں ایک مضمون میں تہذیبی ٹکراؤ کی پیشین گوئی کی ا۔ اس مضمون نے غیر معمولی طور پر علمی حلقوں میں ایک فکری ہل چل پیدا کی اور ہر دو جانب سے اس پر تنقید و توثیق کرتے ہوئے اہل علم نے اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کیا۔ ایک مورخ ہونے کے باوجود شاید

1- Samuel P. Huntengton, "The Clash of Civilization", *Foreign Affairs*, New York, Vol. 72, No. 3 Summer 1993, pp. 23-49; Abou Huntijah, "If not Civilization What? Paradigm of Past-cold war period", *Foreign Affairs*, New York, Vol. 72, No. 5, Nov-Dec. 1993, pp. 186-198.

ہنٹنگٹن کو خود بھی اپنے مفروضہ کے اس طرح زیر بحث آنے کی توقع نہ تھی۔ عالمی سیاسی حلقوں میں شاید اس کے اثرات کچھ عرصہ کے بعد ظاہر ہوتے لیکن ۱۱ ستمبر کو عالمی تجارتی مرکز کے انہدام کے نتیجہ میں عالمی بساط پر جو واقعات رونما ہوئے ہیں انہوں نے ہنٹنگٹن کے مفروضے کی فنی اور فکری کمزوریوں کے باوجود بڑی حد تک اس کے تصور کی تصدیق کر دی ہے۔ چنانچہ صدر امریکہ کا پہلا ردعمل ہی اس بات کا مظہر تھا کہ تجارتی مرکز کا انہدام ایک نئی صلیبی جنگ کے آغاز کا اعلان ہے۔ اور انہوں نے بزعم خود یہ اعلان بھی کر دیا کہ یہ جمہوریت اور تہذیب کے خلاف بربریت اور دہشت گردی کی طرف سے حملہ ہے جس کا جواب وہ مستقل جنگ کی شکل میں نہ صرف امریکہ بلکہ یورپی اقوام کو ساتھ ملا کر دیں گے۔

اس اعلان کو عملی شکل یوں دی گئی کہ کسی ثبوت کے بغیر محض شبہ اور گمان کی بنا پر اسامہ بن لادن کو مجرم تصور کرتے ہوئے طالبان حکومت اور افغانستان کے بے وسائل افراد پر جدید ترین فضائی قوت کو تجرباتی طور پر آزمانے کا فیصلہ کر کے امریکہ اور برطانیہ نے مشترکہ طور پر ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء سے ''تہذیبی جنگ'' کو ایک انسانیت سوز ریاستی دہشت گردی کی شکل میں عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ مفروضہ جو کل تک محض ایک مورخ کا قیاس تھا ایک تاریخی حقیقت میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن اس عمل میں ہنٹنگٹن کے تجزیہ سے کتنی مناسبت ہے اور کیا واقعی امریکی اور برطانوی دہشت گرد حملے ایک تہذیبی جنگ کی علامت ہیں یہ بات غیر جانبدارانہ علمی تحقیق کی دعوت دیتی ہے۔

ہنٹنگٹن کا مفروضہ پانچ فکری بنیادوں پر استوار ہے۔ اس کا پہلا مفروضہ یہ ہے کہ تہذیبیں اپنی اصلیت میں مکمل طور پر مختلف اور منفرج ہوتی ہیں اور ان میں اشتراک و تعاون کا امکان بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں دوسری خصوصیت یعنی ان کا ٹکراؤ وجود میں آتا ہے اور یہ بڑی حد تک ایک منطقی ضرورت بن جاتا ہے۔ تیسری چیز جس پر اس نے اپنی فکر کے تانے بانے بنے یہ

تصور ہے کہ تہذیبیں دراصل نسل اور مذہب کی بنیاد پر اپنا تشخص قائم کرتی ہیں۔ جبکہ چوتھی اہم چیز جس پر وہ زور دیتا ہے مغربی تہذیب میں پایا جانے والا ایک فکری اور ثقافتی اتحاد ہے جس کی بنا پر دنیا گویا مغرب اور ''غیروں'' (others) میں تقسیم ہے اور مغرب کا مقابلہ بقیہ ''دوسروں'' کے ساتھ ہے۔ آخری نکتہ جو اس کی فکر کو چھاننے پھٹکنے سے ملتا ہے اور جو اس کی فکر کا حاصل بھی کہا جا سکتا ہے یہ ہے کہ دنیا میں متوازی ثقافتی، دینی، تہذیبی وجود کی جگہ تہذیبی ٹکراؤ کے بعد ایک غالب تہذیب کی فوقیت قائم ہونے کے امکانات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ گویا ہنٹنگٹن کو ثقافتی اور دینی کثرتیت pluralism کا امکان کم سے کم تر ہوتا نظر آ رہا ہے۔

ان پانچوں نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے، جنہیں ہم نے ممکنہ اختصار کے ساتھ اوپر بیان کر دیا ہے، اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے افغانستان پر حملہ کا ہدف کیا واقعی Sino-Islamic اتحاد کے امکان کو ختم کرنا ہے یا نام نہاد مغرب ہی نہیں بلکہ چین کو بھی اپنے ساتھ کسی نہ کسی حیلے سے شامل کر کے اسلام پسند قوتوں کو کچلنا ہے؟

گزشتہ چند ماہ کے واقعات کے تسلسل پر غور کیا جائے تو یوں نظر آتا ہے کہ شطرنج کے مہروں کی طرح بساط سجاتے وقت مسلم اور غیر مسلم دنیا کے حکمرانوں کی نفسیات اور عوامی ردعمل (معاشرتی نفسیات) کے پیش نظر اس کھیل میں متوقع طور پر جیتنے اور ہارنے والوں کا تعین بھی کر لیا گیا تھا اور پھر اسے کمال چابکدستی سے ایسے حالات میں رُو بہ عمل لایا گیا کہ واردات کرنے والوں کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہ کہی جا سکے اور بار بار جو دعویٰ کیا جائے وہی سچ مان لیا جائے۔

اتنی عمدگی سے چار مختلف مقامات سے جہازوں کا اغوا، عسکری مہارت کے ساتھ انتہائی تیز رفتاری سے جہازوں کو مطلوبہ ہدف پر ٹکرانا (جو انسانی نگاہ کے ذریعہ ناممکن ہے، اور صرف اعلیٰ حساس آلات کے ذریعہ ہی ممکن ہے، جو تجارتی جہازوں میں نصب نہیں ہوتے) پھر تجارتی مرکز کی عمارت کے ایسے حصے پر ضرب لگانا جس کے بعد وہ محض تباہ نہ ہو بلکہ منہدم ہو، اس پوری کارروائی کا

مقصد کیا صرف یہ تھا کہ امریکہ کے تجارتی اور دفاعی مراکز کو نہ صرف مکہ بلکہ ایک زوردار طمانچہ تو رسید کر دیا جائے لیکن امریکہ میں اس کا کوئی ردعمل نہ ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ پوری دنیا طمانچہ مارنے والے کی گرویدہ ہو کر واہ واہ کرنے لگے! اور امریکہ علی الاعلان اپنی کمزوری، بے بسی، اور لاچاری کا اعلان واقرار کرتے ہوئے اس واقعہ کے ذمہ دار افراد کو بددعا دیتے ہوئے صبر وتحمل کے ساتھ دوبارہ تجارتی مرکز کی منہدم عمارت کی تعمیر میں لگ جائے گا؟ اگر فی الواقع اتنے عمدہ اور فنی مہارت کے ساتھ تخریبی منصوبہ ساز افراد کے ذہن میں یہ سوالات کبھی نہ ابھرے تو وہ اس منصوبے کے خالق بھی نہیں ہو سکتے۔

اگر اس منصوبہ کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ اس حملہ کے نتیجہ میں اسرائیل سے اپنی دوستی سے ہاتھ روک لے گا اور حماس کی حمایت کا اعلان کر دے گا تو غالباً اس سے زیادہ طفلانہ خیال اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر مقصود یہ تھا کہ حملہ کو ابھی دس منٹ بھی نہ گزریں اور عالمی میڈیا اور اس کے حواری سب مل کر مسلمانوں، اسلام اور مسلم ''بنیاد پرستوں'' کو مورد الزام ٹھہرائیں تو یہ بات ہر لحاظ سے منطقی اور منصوبہ کا اصل مقصد معلوم ہوتی ہے۔ اگر عالمی تجارتی مرکز کا انہدام اور امریکی دفاعی وزارت پر حملہ کا مقصد مسلمان دشمنی میں شدت پیدا کرنا اور اس کے نتیجہ میں عالمی نقشہ پر مسلمانوں کے ساتھ ایک صلیبی جنگ کی کیفیت پیدا کرنا تھا تو کیا اس کا محرک کسی ''جہادی'' گروہ کو ہونا چاہیے یا اس کی پشت پر صیہونی سازش کو ہونا چاہیے؟ جس طرح جہازوں اور عمارتوں کو تباہ ہونا تھا اس کے بعد ملبہ سے کوئی سراغ ملنا عملاً ناممکن ہوتا ہے اس لیے جو دعویٰ بھی کیا جائے گا اس کا واقعی ثبوت ملنا کہ فلاں شخص اصل ہائی جیکر تھا محض قیاس ہی ہوگا۔ جس طرح پورے معاملہ کو فنی مہارت کے ساتھ کیا گیا اس کے بعد یہ کہنا کہ کار پارک میں جس گاڑی کے بارے میں دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ اسے ہائی جیکروں نے استعمال کیا ہوگا اس میں قرآن کریم پایا گیا یا عربی میں جہاز چلانے کی ترکیب پائی گئی مسلمانوں کی طرف ذہن کو متوجہ کرنے کی واضح سازش نظر آتی ہے۔ جو ہائی جیکر

امریکہ کی تمام خفیہ اداروں کے چوکس ہونے کے باوجود خود امریکہ ہی میں تربیت پاکر چار مختلف مقامات پر بیک وقت اس طرح باہمی coordination سے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ اتنے ناتجربہ کار نہیں ہو سکتے کہ اپنا پاسپورٹ، شناختی کارڈ یا ایسی چیزیں ساتھ رکھیں جو ان تک رسائی کا سبب بن سکیں۔

ان واقعات کے پس منظر میں جو تبدیلیاں عالمی طور پر وجود میں آ گئی ہیں ان کی طرف بھی چند اشارے ضروری ہیں۔ پہلی بات تو یہ واضح ہو چکی ہے کہ بار بار یہ کہنے کے باوجود کہ یہ جنگ مسلمانوں یا اسلام کے خلاف نہیں ہے اس واقعہ کے بعد صرف اور صرف مسلمانوں کو امریکہ اور برطانیہ میں، جرمنی اور فرانس میں، کینیڈا اور آسٹریلیا میں غرض مغربی دنیا میں نہ صرف ملزم بلکہ مجرم گردانتے ہوئے متعصبانہ طرز عمل اور تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

دوسری بات یہ بھی واضح ہے کہ اس کے نتیجہ میں بجائے مسلم چینی اتحاد کے چینی اور روسی اور امریکی اتحاد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وجود میں آتا نظر آ رہا ہے۔ تیسری بات یہ کہ اس واقعہ کے فوراً بعد اسرائیل کی طرف سے فلسطین میں اور انڈیا کی طرف سے کشمیر میں تحریک آزادی پر ظلم و تشدد میں یک دم اضافہ ہوا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ پاکستان جو ابھی چند ماہ قبل چین کو اپنی معاشی ترقی میں شرکت کی طرف متوجہ کر رہا تھا اور بعض ترقیاتی منصوبوں خصوصاً پسنی کی بندرگاہ اور شاہراہ ریشم کے علاوہ بجلی کی پیداوار میں اس سے تعاون کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اب وہ امریکی جارحانہ پالیسی کا حصہ بن کر چین کی نگاہ میں غیر معتبر بنتا جا رہا ہے۔ اب جبکہ پاکستان امریکہ کا ساتھ (چاہے مجبوراً) دے رہا ہے گزشتہ ۱۵ سال میں جو برادرانہ تعلقات افغانستان سے استوار ہوئے تھے وہ یکمشت مخالفت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان تمام اہداف کے حصول کا منصوبہ ''القاعدہ'' کو بنانا چاہیے تھا یا کسی صیہونی دفاع کو؟

جو معاندانہ فضاء اس عالمی سازش کے نتیجہ میں پیدا ہوئی اس کا حل؟ ہمارے خیال میں ہر

شے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے اس لیے اولاً اسلام کے حوالے سے اس وقت جو بے بنیاد افواہیں اور غلط معلومات نشر کی جارہی ہیں انتہائی گرم جوشی اور حکمت کے ساتھ ان کی اصلاح کرتے ہوئے صبر و استقامت اور حکمت کے ساتھ اپنی بات کو پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلم دانشوروں اور اہل علم کا فرض ہے کہ وہ مغرب کے ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بغیر کسی معذرت کے قرآن وسنت پر مبنی معلومات کو بغیر کسی مداہنت کے صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کریں تاکہ اس وقت جو تجسس پایا جاتا ہے اسے دعوتِ دین اور دعوتِ حق کے لیے اسلام کے حق میں استعمال کیا جاسکے۔ جرمنی میں ہونے والی کتابوں کی ایک حالیہ نمائش میں پہلے اس بات پر بحث ہوئی کہ اسامہ بن لادن اور مسلمانوں پر کتابیں رکھی جائیں یا نہیں اور جب طے ہوا کہ رکھی جائیں تو سب سے زیادہ دینی کتب کی فروخت ہوئی۔

اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلم فرمان روا جس عالمی قوت کو اپنا اصل سہارا اور ''خدا'' سمجھتے ہیں کیا وہ خود اپنے ملک میں اپنے اداروں کا دفاع کرسکتی ہے اور کیا وہ کسی دوسرے کا دفاع اپنے سے زیادہ کرسکتی ہے؟ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم کے واقعہ میں ہمارے لیے سامانِ عبرت ہے۔ قرآن کی تمثیل میں دیکھا جائے تو امریکہ جو اپنے بارے میں سب سے بڑا ''خدا'' کا بت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس بڑے بت کے سامنے اس کے معاشی بت کو پاش پاش کر دیا گیا اور وہ یہ سب ہوتے دیکھتا رہ گیا۔ جو بت اپنے بت خانے کے چھوٹے بتوں کو نہ بچا سکا کیا اس کی وہ افواج اور اسلحہ جو مسلم ممالک کی حفاظت کے لیے ان کی حدودِ مملکت میں رکھے گئے ہیں مسلم ممالک کو بچا سکتے ہیں؟

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابلاغ عامہ کی اس یلغار میں صرف الجزیرہ ٹی وی نے حقائق پر مبنی معلومات دینے کی کوشش کی جبکہ مسلم دنیا بشمول پاکستان مغربی مفادات کے تحفظ کے پیش نظر تراشیدہ اطلاعات فراہم کررہے ہیں۔ یہ ابلاغی شتر مرغ جو اپنے ٹی وی پر صرف چین وسکون کا ذکر

کرتے ہیں کب تک اس زیر سطح طوفان کو دبا سکتے ہیں جو ابلنے کے بعد پھٹا چاہتا ہے؟ کیا اہل ایمان کا شیوہ یہی ہونا چاہیے! اگر اہل ایمان اس جہاد میں عملاً شامل نہ ہوسکیں جو مال اور نفس سے کرنا فرض کر دیا گیا ہے تو کیا زبان اور قلم سے حق کی حمایت اور کفر، صیہونیت اور عالمی سامراج کی مخالفت کرنا بھی ہمارے بس میں نہیں ہے۔

اس شمارے میں اپنی سابقہ روایت سے تھوڑا ہٹتے ہوئے ہم شریف شجاع صاحب کا مضمون، جس میں اختصار سے مغرب کے طرز فکر کا پس منظر پیش کیا گیا ہے، شامل کر رہے ہیں۔ اب تک ہماری پالیسی یہ رہی ہے کہ مضامین صرف مغرب کے رجحانات کو ان ہی کے الفاظ میں پیش کریں اور اداریے میں کسی ایک موضوع پر ہمارا نقطۂ نظر سامنے آئے۔ یہ ہماری پالیسی میں تبدیلی کی علامت ہے۔ اس شمارے کے ساتھ اب تک کا اشاریہ بھی دیا جا رہا ہے۔ جریدے کی پالیسی کے حوالہ سے مزید یہ بھی عرض کرنا ہے کہ ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ شماروں میں ہم صرف ایک موضوع کو ایک شمارہ میں پیش کریں۔ اس سلسلہ میں آپ کی آراء اور تنقید ہمارے لیے بہت مفید ہوگی۔